

میر تقی میر (غزل نمبر 2)

(بورڈ 2011)

شعر نمبر 1:

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش!
رہتی ایک آدھ دن، بہار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”اے صبح کی ہوا! کاش پھول ہمیشہ رہتا اور بہار کچھ دن مزید رہ جاتی۔“
باغ کی ساری رونقیں پھول کی بدولت ہوتی ہیں۔ پھول اپنی نزاکت، رنگت، خوشبو اور خوبصورتی سے باغ کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ موسم بہار میں جب مختلف رنگوں کے پھول کھلتے ہیں تو عاشق پرندے مسرت اور خوشی سے چہچہاتے ہیں۔ مگر کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح پھول کی زندگی بھی عارضی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ میر کا کہنا ہے:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شعر میں صبا (صبح کی ہوا) کو مخاطب کر کے اُسے پھول کی عارضی زندگی کے دکھ میں شریک کیا گیا ہے اور اس حسرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ کاش پھول کی زندگی طویل ہوتی۔ دراصل صبح کی ہوا کا پھول کی زندگی میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ پھول کا کھلنا، ہر طرف اُس کی خوشبو پھیلنا اور اُس پھول کا مرجھانا ہوا کی بدولت ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے شاعر پھول کی عارضی زندگی کا غم صبح کی ہوا سے بیان کر رہا ہے۔

دیکھا جائے تو جس طرح پھول کی زندگی عارضی اور مختصر ہوتی ہے اسی طرح وصل کے خوب صورت ایام، محبوب کے ساتھ گزرے حسین لمحات بھی عارضی اور مختصر ہوتے ہیں۔ چنانچہ میر کی یہ آرزو اور حسرت ہے کہ کاش وصل کے ان مختصر لمحات میں اضافہ ہو جاتا۔ احمد فراز کا کہنا ہے:

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک اور حسرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ کاش بہار بھی کچھ دن مزید رہ جاتی۔ بہار کے موسم کا ذکر اردو شاعری میں دو حوالوں سے ہوتا ہے۔ 1: خوش گوار موسم کے حوالے سے۔ 2: وصل یا اچھے حالات کے حوالے سے۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان خوش گوار ماحول میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے کیوں کہ ماحول کے اثرات انسانی زندگی پر بڑی شدت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر ماحول خوش گوار ہو تو انسان کی طبیعت بھی بشاش رہتی ہے۔ بہار کا موسم خوش گوار موسم ہوتا ہے۔ بہار کے آتے ہی ہر چیز خوب صورت ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ بہار کا خوش گوار موسم بھی عارضی اور مختصر ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہار کے خوب صورت ایام بھی گزر جاتے ہیں۔ عدم کا کہنا ہے:

مسکرانے لگی تھی ایک کلی
کہ اچانک بہار بیت گئی

بہار کے جاتے ہی باغ کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ باغ پر اُدا سی چھا جاتی ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں، پتے جھڑ جاتے ہیں، پرندے باغ

سے ہجرت کر جاتے ہیں اور باغ ویران دکھائی دیتا ہے۔ بہار کے جانے کا دکھ نہ صرف انسانوں، درختوں، پرندوں کو ہوتا ہے بلکہ دنیا کی ہر چیز بہار کے جانے کا افسوس کرتی ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں

ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لیے

اُردو شاعری میں بہار کا ذکر اچھے حالات اور وصل کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس خزاں کو برے حالات کی علامت بنایا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کے اچھے حالات اور اچھے دن بھی بہار کی طرح خوش گوار اور محدود ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے انسان کی زندگی کے اچھے دن بھی گزر جاتے ہیں۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اچھے حالات اور وصل کے ایام مزید بڑھ جائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے خوش گوار لمحات بہت تیزی سے گزر جاتے ہیں اور برے حالات جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اقبالؒ کا کہنا ہے:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں

اور گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

شعر نمبر 2:

یہ جو دو آنکھیں، مند گئیں میری

اس پہ وا ہوئیں، ایک بار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”میری دو آنکھیں جو بند ہو گئی ہیں کاش موت سے پہلے ایک دفعہ محبوب کو دیکھ لیتیں۔“

انسانی فطرت ہے کہ انسان کو جو شے اچھی لگتی ہے۔ انسان اسے ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ جوں جوں وابستگی بڑھتی ہے اسی اعتبار سے دیکھنے کی خواہش بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہستی چاہے اللہ کی ذات ہو، اپنے جیسا کوئی انسان ہو یا کوئی اور شے ہو انسان کو جتنی اچھی لگتی ہے، اتنا ہی انسان اسے دیکھنے رہنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا۔ اقبالؒ کی شاعری میں بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش کا مضمون کثرت سے ملتا ہے۔ اسی طرح اگر محبوب مجازی بھی ہو تو عاشق کی کی آنکھ کو محبوب کے دیدار کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی جب اُس کو دیدار نصیب نہیں ہوتا تو اُس کی آنکھیں محبوب کے انتظار میں بے نور ہو جاتی ہیں اور ایک دن آتا ہے کہ جب اُس کی آنکھیں بالکل ہی بند ہو جاتی ہیں۔ میر کا کہنا ہے:

آنکھیں گئیں روتے روتے لیکن

تُو نے نہ ادھر کو یار دیکھا

عاشق کی آنکھ بند ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی اُس کی حسرت دیدار برقرار رہتی ہے۔ زندگی میں محبوب عاشق کو دیدار سے محروم رکھتا ہے۔ عاشق کی حسرت ہوتی ہے کہ کاش ایک بار مرتے مرتے ہی محبوب سے اُس کا سامنا ہو جائے تاکہ اُسے زندگی کے آخری لمحات میں دیکھ لے۔ عاشق کی جان محبوب کے انتظار میں آنکھوں میں آئی ہوتی ہے اور اُس کی یہی آخری حسرت ہوتی ہے کہ کاش محبوب اُس کی آنکھوں میں بھری سچائی اور انتظار دیکھ سکے۔ میر کا کہنا ہے:

آنکھوں میں جی میرا ہے ادھر یار دیکھنا

عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

”جب وقت محدود ہو اور جدائی یقینی ہو تو ایسے میں محبت بڑھ جاتی ہے اور ایک ایک پل انسان کو قیمتی محسوس ہوتا ہے۔“ اسی لیے وہ شخص جو موت کے قریب ہو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہستی جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ میر تقی میر کا موقف بھی یہی ہے کہ وہ آنکھیں جو ہمیشہ کے لیے بند ہو رہی ہیں کاش آخری دفعہ محبوب کو دیکھ سکتیں اور مرتے وقت محبوب سے آمنہ سامنا ہو جاتا۔ داغ کا کہنا ہے:

آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے

تشریح طلب شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق کی موت کے بعد عام طور پر محبوب کو ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے اور محبوب عاشق کی لاش پر آتا ہے تو اُس وقت عاشق کی یہی کیفیت اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش اُس کی بند آنکھیں کھلیں اور مرتے مرتے محبوب کا دیدار نصیب ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی نے یہی مضمون بڑے آسان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

اُن کی صورت ذرا دکھا دینا
منہ سے میرے کفن ہٹا دینا

مومن خاں مومن کا کہنا ہے:

وہ آئے ہیں پشیمیاں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

شعر نمبر 3:

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم، شمار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پڑنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”دنیا میں ہر کوئی اپنے غم گنتا رہتا ہے کاش کوئی میرے غم بھی شمار کر لیتا۔“

غم ہمیشہ احساس محرومی سے جنم لیتا ہے۔ جب انسان کی کوئی خواہش پوری نہ ہو، اُس سے کوئی چیز چھن جائے، اُسے کسی شے سے محروم کر دیا جائے تو اُسے دکھ ہوتا ہے۔ انسان کو دنیا کی زندگی میں کئی غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غم کبھی تو جان و مال کی کمی اور نقصان کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی خاندانی مسائل اور بیماریاں بھی انسان پر غم اور مصیبت بن کر ٹوٹتی ہیں۔ اسی طرح عشق میں بھی عاشق کو بہت سے غم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ غرضیکہ انسانی زندگی غموں، دکھوں، پریشانیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کا مجموعہ ہے۔ میر نے اپنے ایک اور خوب صورت شعر میں زندگی کے مسلسل غموں کی داستان کچھ یوں سنائی ہے:

غم رہا جب تلک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

میر تقی میر کا موقف ہے کہ دکھ تو ہر کسی کو ملتا ہے لیکن بیشتر لوگوں کے غم اور دکھ محدود ہوتے ہیں، گنے جاسکتے ہیں۔ لیکن جو دکھ مجھے ملے وہ ان گنت ہیں۔ ان کو کوئی شمار نہیں ہے۔ میر کا کہنا ہے:

میرے ایک دل میں جو غم یہ ہے، سو فزوں ہے میرے شمار سے
نہ تو دس میں نہ پچاس میں نہ تو سو میں نہ ہزار میں

حسرت موہانی کا کہنا ہے:

دلوں کے زخم کا جب حساب نہ ہو
کیا کہیں گر نہ بے شمار کہیں

میر تقی میر کی ذاتی زندگی دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھیں پے در پے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بچپن میں ان کے والد انتقال کر گئے۔ بڑے بھائی نے گھر سے نکال دیا۔ آگرے سے دہلی آئے اپنے رشتے کے ماموں کے یہاں ٹھہرے لیکن ان سے بھی میر کی نہ بن سکی وہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ میر دہنی تو ازن کھو بیٹھے۔ علاج کے بعد تندرست تو ہو گئے مگر مصیبتوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ عشق میں ناکامی ہوئی۔ میر کے عہد کے اجتماعی حالات بھی ایسے ہی تھے کہ مسلسل مصیبتیں اجتماعی زندگی کو تباہ و برباد کر رہی تھیں۔ غرض میر کی ساری زندگی دکھ جھیلے ہوئے گزر گئی۔ تشریح طلب شعر میں وہ اپنے کسی غم خوار اور غم گسار دوست کی تلاش میں ہیں اور انھیں احباب سے یہ شکوہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی مسائل اور الجھنوں میں گرفتار ہے۔ کوئی بھی ایسا دوست یا درو آشنا نہیں ہے جو میری داستان غم سنے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

ہائے میں ڈھونڈ کے لاؤں کس کو
ماجرا اپنا سناؤں کس کو

ناصر کاظمی کا کہنا ہے:

ہر کوئی اپنے غم میں ہے مصروف
کس کو درد آشنا کہے کوئی

شعر نمبر 4:

(بورڈ 2017ء)

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی، میں نثار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”جب زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے تو کاش میں یہ زندگی محبوب پر قربان کر دیتا۔“

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ کائنات میں خدا، رسول ﷺ اور آخرت کا انکار کیا جاتا ہے لیکن کائنات کا کوئی شخص بھی اس حقیقت کا انکار نہیں ہے۔ انسان کا مشاہدہ ہے کہ موت سے فرار ممکن نہیں۔ جو لوگ ماضی میں موجود تھے آج نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ جو بھی یہاں آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ ہر جان دار کا آخری انجام یہی ہوتا ہے کہ بالآخر وہ اس عارضی اور ناپائیدار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

آخر اک روز جان جانی ہے
یہی دو دن کی زندگانی ہے

میر تقی میر کی یہ حسرت ہے کہ جب جان نے بالآخر جانا ہی تھا تو کاش میں اپنی یہ جان محبوب پر ہی قربان کر دیتا۔ محبوب سے مراد اگر اللہ

کی ذات لیں تو اللہ کے لیے جان قربان کرنا ہر مسلمان کی دلی حسرت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں شہید کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔“ انسان کے پاس زندگی اللہ کا دیا ہوا عطیہ ہے اور اللہ کی ذات ہی اس لائق ہے کہ یہ زندگی اُسی کی راہ میں قربان کر دی جائے۔ غالب کا کہنا ہے:

جان دی، دی ہوئی، اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر ”اس“ سے مراد محبوب مجازی لیا جائے تو ہر سچے عاشق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان کا قیمتی تحفہ محبوب کی نذر کر دے۔ سچا عاشق ہر وقت محبوب کے لیے جان قربان کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ غالب کا کہنا ہے:

جان تم پہ نثار کرتا ہوں

میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

عشق کے میدان میں جان نثار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عشق کی راہ میں جان قربان کرنے والے کا نام یاقی رہ جاتا ہے۔ یوں اُس کی عارضی زندگی دائمی بن جاتی ہے اور دنیا سے جانے کے بعد بھی لوگوں میں اُس کی سچائی، وفاداری، خلوص اور جان بازی کے چرچے رہتے ہیں۔ حسرت کا کہنا ہے:

تم پر مئے تو زندہ جاوید ہو گئے

ہم کو بقاء نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

محبوب پہ جان قربان کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عاشق اپنی جان قربان کر کے محبوب کو اپنی سچائی کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ زندگی بھر محبوب کے سامنے جان تک قربان کر دینے کے دعوے کرتا رہتا ہے۔ اُس کی یہ خواہش اور حسرت ہوتی ہے کہ محبوب پر جان قربان کر کے اپنے دعووں پر عمل کر دکھائے اور محبوب کو بھی اس کی سچائی کا یقین ہو جائے۔ حسرت موہانی کا کہنا ہے:

مر مئے ہیں اس لیے کہ ہمیں

شاید وہ اپنا جان نثار کہیں

شعر نمبر 5:

(بورڈ 2017ء)

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی

شعر ہوتا ترا شعرا، اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”اے محبوب! اگر تمہیں شاعری سے دل چسپی ہوتی تو ہمارے تمہارے درمیان گفتگو کا امکان بھی موجود ہوتا۔“

ہر عاشق کی یہ حسرت ہوتی ہے کہ کسی طرح محبوب سے گفتگو اور بات چیت کی کوئی راہ نکلے۔ وہ دن رات یہی سوچتا رہتا ہے کہ کس طرح محبوب سے گفتگو کا سلسلہ بنے۔ تشریح طلب شعر میں بھی میر کا موقف بھی یہی ہے کہ محبوب سے ہماری بات چیت کا راستہ اس طرح نکل سکتا تھا کہ

اُسے بھی شاعری کی سوجھ بوجھ ہوتی۔ ذرا اصل شعر و شاعری سے انسان اپنے دل کی کیفیات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات کو شعروں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ حبیب جالب کا کہنا ہے:

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اٹھائے ہیں، شاعری کی ہے

شاعری دراصل انسانی جذبات کی عکاسی ہے اور شاعر شاعری کے پردے میں محبوب سے گفتگو کرتا ہے۔ جو بات شاعر محبوب کے روبرو بیان نہیں کر سکتا اُس کا اظہار اپنے اشعار کے ذریعے کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے عاشق سرِ عام محبوب سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ شاعری کو محبوب سے گفتگو کا ایک پردہ بناتا ہے اور اسی پردے میں اپنے دل کا غم بیان کرتا ہے۔ میر کا کہنا ہے:

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو! شعارِ عشق

شعر و شاعری میں عام طور پر کئی فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ شاعر اپنا خیال پیش کرتے ہوئے تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور مختلف کنایات کا استعمال کرتا ہے۔ شاعری کی یہ باریکیاں ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو فنِ شاعری سے آشنا ہو۔ میر کا بھی یہی کہنا ہے کہ میرا محبوب شعر و شاعری میں خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ اُسے شاعری کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ اسی لیے کسی شاعر کے اشعار اُسے متاثر نہیں کرتے۔ آتش کا کہنا ہے:

دہن یار میں نہ آئی بات
شاعروں نے بہت بنائی بات

میر تقی میر کا موقف یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مرکز و محور شاعری ہے لیکن محبوب کو شاعری سے کچھ دل چسپی نہیں ہے اس لیے ہمارے اور اس کے درمیان گفتگو کا کوئی امکان بھی موجود نہیں ہے۔ اگر اسے شاعری سے دل چسپی ہوتی ہمارے درمیان گفتگو ہوتی تو شاید دوستی کے امکانات بھی پیدا ہو جاتے لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا بلکہ ہمیں شاعر بنانے والا خود شاعری سے نا آشنا رہا۔ احمد فراز کا کہنا ہے:

ستم تو یہ کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ اک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

عام طور پر دو افراد کے درمیان کوئی تعلق اسی وقت تشکیل پاتا ہے جب ان کے درمیان کوئی قدر مشترک ہو۔ دوستی بھی تبھی ہوتی ہے جب افراد کی دلچسپیاں مشترک ہوں۔ شاعر کی بھی یہی خواہش ہے کہ کاش اگر محبوب شاعری سے آشنا ہوتا تو ہم میں شاعری کی قدر مشترک ہو جاتی اور یوں ہماری گفتگو کا سلسلہ بن جاتا۔ غالب کا کہنا ہے:

دیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

شعر نمبر 6:

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار، اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرہ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غم دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی

ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیر تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ”دنیا اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی ہے۔ کاش میرا محبوب سے سامنا نہ ہوتا۔“
محبت کے بارے میں دو مختلف رویے موجود ہیں بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ محبت کا غم دنیا بھر کے دکھوں کا مداوا بن جاتا ہے لیکن بیشتر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ محبت کرنا دنیا بھر کی مصیبتوں کو گلے لگا لینا ہے اور محبت کرنے والے کو دکھوں کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عشق آگ کا ایک دریا ہے جس میں عاشق کو قدم قدم پر مصیبتوں، پریشانیوں اور غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جگر مراد آبادی کا کہنا ہے:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

تشریح طلب شاعر میں میر کا موقف بھی یہی ہے کہ محبوب سے ملاقات سے قبل میں خوش حال تھا، مسرور اور دلشاد تھا، بے فکر اور آباد تھا لیکن محبوب کا سامنا ہوتے ہی ساری خوشیاں تباہ ہو گئیں اور اتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا کہ چھ اطراف (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) مجھ پر تنگ ہو گئی ہیں۔ یعنی میں ہر طرف سے پھنس گیا ہوں اور یہ ساری مصیبتیں صرف محبوب کی وجہ سے ہی پیش آئی ہیں۔ جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے:

جب سے عاشق ہوئے ہیں تمہارے ہم

لگ گئے گور کے کنارے ہم

میر کا موقف یہ ہے کہ محبت کرنے کے بعد مجھے اتنے دکھ اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں کہ جینا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ دنیا اپنی وسعت کے باوجود تنگ محسوس ہونے لگی ہے۔ محبوب کی بے رخی اور محبت کے دشمن معاشرے نے ایسی مصیبتیں کھڑی کر دی ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ کاش میں محبوب سے یاری نہ کرتا اور اُس سے میرا سامنا نہ ہوتا تو مجھے یہ مسائل نہ دیکھنے پڑتے۔ میر کا کہنا ہے:

خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو

ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک

یا میر کا کہنا ہے:

پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

دوسرے مصرعے میں لفظ ”اُس“ کو اگر اس پڑھا جائے تو ایک مفہوم یہ سامنے آتا ہے کہ کاش میں پریشانی کی اس صورتحال سے دوچار نہ ہوتا۔ میر کو اپنی زندگی میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خاندان اور گھر سے دوزی برداشت کرنا پڑی۔ عشق ناکام ہوا اور معاشی حالات بھی خراب رہے۔ الغرض اُن کی زندگی دکھوں اور غموں کا مجموعہ رہی۔ اُن کا کہنا ہے:

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری

ہر شام غمی اک مصیبت گزری

☆☆☆☆☆